بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اعلیٰ حضرت شاہ فیصل کے دورِ حکومت میں مملکتِ سعودی عرب میں جس طرح دُور رس تبدیلیاں ہو رہی ہیں، اس سے بآسانی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ ملک جو نظم و نسقِ حکومت، معاشی زندگی کی تنظیم، معاشرتی تصورات اور ذہنی فکر و نظر کے لحاظ سے دنیائے اسلام کے سب سے زیادہ قدامت پسند ملکوں میں سے تھا، چند سالوں میں ایک نیا قالب اختیار کر لے گا اور وہاں نئی زندگی کے ساتھ ساتھ نیا ذہن بھی بروئے کار آجائے گا۔ سعودی عرب میں یونیورسٹیاں کھل رہی ہیں، انجینئرنگ کالج بن رہے ہیں، صنعتیں قائم کی جا رہی ہیں، بڑے شہروں میں چیمبرز آف کامرس وجود میں آرہے ہیں۔ سعودی عرب کے اخبارات دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ گویا قاہرہ (مصر) سے نکلنے والے اخبارات ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم پر زور دیا جا رہا ہے۔ اور تو اور ریاض میں سپورٹس کلب بن رہے ہیں اور طے کیا گیا ہے کہ کھیلوں کے ریفریوں اور ایمپائروں کو ٹریننگ کے لئے بیرونِ ملک بھیجا جائے۔ مواصلات کو وسیع سے وسیع تر کیا جا رہا ہے۔

قدرتاً نظامِ معیشت کی تبدیلی کا براہ راست اثر ملک کی معاشرت پر پڑا ہے اور سعودی معاشرہ میں عورتیں زیادہ نمایاں نظر آنے لگی ہیں۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں استانیاں، سماجی کارکن، نرسیں اور طبی ماہر بن رہی ہیں۔ بعض سعودی خواتین غیر ملکی یونیورسٹیوں سے گریجویٹ ہو چکی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ سعودی مملکت کے حکمراں بجٹ کے قائل نہ تھے اور نہ ملک میں کوئی سرکاری بنک تھا جو کرنسی کو کنٹرول کرتا۔ لیکن اب یہ سب باتیں قصۂ ماضی بن چکی ہیں۔ سعودی عرب بڑی سرعت سے اپنے مالیاتی نظام میں جدید بن رہا ہے اور شاہ فیصل شخصی طور پر اس میں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔

سعودی مملکت کی وزارتِ اطلاعات انگریزی زبان میں اپنا ایک ہفت روزہ پرچہ نکالتی ہے۔ اس کی ۱۴ جون کی اشاعت میں ملک میں پہلے پنج سالہ اقتصادی ترقیاتی منصوبے کے تشکیل پذیر ہونے کی خبر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ منصوبہ بندی کی مرکزی کمیٹی کے قائم مقام صدر نے کل اقتصادی رپورٹ کی تکمیل اور مختلف وزارتوں اور سرکاری ایجنسیوں سے پنج سالہ اقتصادی ترقیاتی پروگرام کے بارے میں اپنی بحث و تمحیص ختم کر لینے کا اعلان کیا ہے۔ اب یہ رپورٹ اور پروگرام جملہ وزارتوں اور ذمہ دار حلقوں کو اظہار رائے کے لئے بھیجے جائیں گے اور اس کے بعد انہیں اعلیٰ حضرت شاہ فیصل کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

یہ سعودی عرب کا پہلا پنج سالہ اقتصادی ترقیاتی منصوبہ ہے۔ اس کے بعد لازماً دوسرا منصوبہ آئے گا، اور پھر تیسرا اور چوتھا، اور جب اقتصادیات میں منصوبہ بندی آجائے، اور پانچ یا دس یا پندرہ سال بعد ملک میں جو اقتصادی تعمیر و ترقی کی جانے والی ہو، اس کا پہلے سے حساب کر لیا جائے، تو زندگی کے دوسرے شعبے، ذہنی، اخلاقی اور مذہبی، اس منصوبہ بندی سے باہر کیسے رہ سکتے ہیں۔ اس طرح کی ہمہ گیر منصوبہ بندی کے جو نتائج نکلتے ہیں، وہ سب کو معلوم ہیں۔

وزارت اطلاعات کے اسی ہفت روزہ پرچے میں شاہ فیصل کا ایک اخباری انٹرویو چھپا ہے۔ جس میں انہوں نے کہا ہے کہ سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ مستقبل میں کوئی غریب نہ رہے۔ غربت کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ عمومی اور ٹیکنیکل تعلیم کی ان دو قسموں میں ایک عام ترقی بہت ضروری ہے کیونکہ ملک کو صنعتی بنانے کا یہی طریقہ ہے۔ اور بالفعل ملک کو صنعتی بنایا بھی جا رہا ہے۔

غرض سعودی عرب کے اربابِ کار ان خطوط پر سوچ رہے ہیں۔

شاہ فیصل ان حکمرانوں میں سے ہیں، جن کی یہ کوشش ہے کہ مسلمان اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے اس طرح ترقی کریں کہ ان کے ہاتھ سے دینی روایات اور اسلام کی اخلاقی و اجتماعی اقدار کا دامن نہ چھٹے۔ لیکن مصر، شام، عراق اور الجزائر میں تو علی الاعلان اشتراکیت کو ایک قومی فلسفہ مان لیا گیا ہے، یہاں تک کہ تیونس کے اعتدال پسند لیڈر بورقیبہ تک بھی "اشتراکیت" کا دم بھرتے ہیں۔ یہ "انقلاب پسند" عرب ملک بس عرب اشتراکیت کا نام لیتے ہیں، اور اسی کو عملی جامہ پہنانے کی بڑے جوش و خروش سے اپنے عوام کو دعوت دیتے ہیں پچھلے دنوں یوم مئی کے موقع پر صدر جمال عبدالناصر نے مصر کے مشہور صنعتی شہر المحلہ میں مزدوروں

کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"ہر شخص کو علم یقین سے یہ جان لینا چاہیئے کہ ہمارا دین، دینِ حریت ہے، دین مساوات ہے، دین عدالت اجتماعی ہے۔ اغنیاء سے فقراء کے لئے لینے کا دین ہے۔ مسلمانوں کے اموال مسلمانوں کے لئے ہیں اس کا دین ہے۔ دین یہ ہے کہ ہم اپنے وطن کی آزادی اور اپنے دین کی عزت کے لئے کام کریں نہ کہ استعمار کیلئے"

یہ سب کہنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔ "برادران کرام! ہم اشتراکی معاشرے کی تعمیر کی راہ پر گامزن ہیں، ایسا معاشرہ جس میں سب کے لئے ایک سے مواقع ہوں، عدالت اجتماعی کا معاشرہ، ترقی پسندانہ انقلاب کا معاشرہ"۔

اور یاد رہے کہ "انقلاب پسند عربوں" کے گروہ میں صدر ناصر کا شمار معتدلین میں سے ہوتا ہے۔

ہمارا قریب ترین ہمسایہ مسلمان ملک افغانستان جس منزل کی طرف بسرعت جارہا ہے، اس کی خبریں ہمارے ہاں اب تک عام نہیں ہوئیں۔ وہاں کے تعلیم یافتہ اور دانشور طبقے میں ہر نوع کی قدامت پسندی کے خلاف، خواہ وہ قبائلی سرداروں کی ہو یا مذہبی علماء کی، منافرت کے بڑے تیز جذبات ابھر رہے ہیں اور وہ صحیح یا غلط طور پر یہ سمجھتا ہے کہ افغانستان کو باقی دنیا سے اس قدر پس ماندہ رکھنے کی سب سے بڑھ کر ذمہ داری ان دونوں پر ہے، چنانچہ وہ طبقہ ان کی مخالفت میں زبان اور قلم ہر دو سے جہاد کر رہا ہے۔ اب یہ بیسویں صدی اور پھر ایک طرف امریکی اقتصادی امداد اور دوسری طرف سوویت یونین کی اقتصادی امداد کے ساتھ ساتھ اس کی جغرافیائی قربت، افغانستان کو قرون وسطیٰ سے بڑی تیزی سے آج کے دور میں لا رہی ہے۔ عام طور سے صدیوں تک ایک مقام پر رُکے رہنے کے بعد جب کوئی کارواں یک بارگی تیز گام ہو کر تلافی مافات کرنا چاہتا ہے، تو اس کی رواروی میں بہت سی چیزیں کچلی جاتی ہیں۔ خدا نہ کرے، استحصال پسند طبقوں کے ساتھ ہمارے علماء بھی اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے اس کی زد میں آجائیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ جو پوری اسلامی دنیا میں ٹیکنیکل اور ایٹمی ایجادات کے نتیجے میں اتنی تبدیلیاں آرہی ہیں، اور ان کی وجہ سے ہمارا سارے کا سارا معاشرہ رُو بہ تغیر ہے، کیا پاکستان پر ان کے اثرات نہیں پڑیں گے۔ پاکستان کی معیشت جن خطوط پر گامزن ہے اور اس کے سامنے جو منزل ہے ظاہر ہے اس میں اشتراکیت کی قسم کی کسی چیز کی گنجائش نہیں، لیکن اس میں تو شک نہیں کہ ہماری منزل مقصود ایک فلاحی مملکت ضرور

ہے۔ جس میں جیسا کہ شاہ فیصل نے فرمایا ہے، مستقبل میں کوئی غریب نہ رہے، تاکہ سب عمومی اور ٹیکنیکل تعلیم حاصل کر سکیں اور ملک صنعتی ترقی کرنے کے قابل ہو جائے۔

اب اگر ہمیں فلاحی مملکت کی منزل مقصود تک پہنچنا ہے، جس کی کہ ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ بتدریج غریب طبقوں کی احتیاج کم ہوتی جائے اور آخر ایک وقت آئے کہ ملک سے غربت بالکل ختم ہو جائے تو اس منزل مقصود تک پہنچنے کی کیا راہ ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں ہمیں سوچنا اور اسے اختیار کرنے کی تدبیر کرنا ہوگا۔

شیوعیت اور ایک حد تک اشتراکیت بھی ملک کے پورے کے پورے ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لے کر افرادِ معاشرہ کی جملہ ضرورتوں کو پورا کرنے کی داعی ہے لیکن فلاحی مملکت میں پیداوار پر ٹیکس لگا کر لوگوں کی ضرورتیں پورا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ مفت طبی امداد، مفت لازمی تعلیم، روزگار کی فراہمی، سر چھپانے کے لئے مکان اور اسی طرح کی دوسری بنیادی احتیاجات کا انتظام ٹیکسوں کی آمدنی سے کیا جاتا ہے۔ ایک فلاحی مملکت کو چلانے کے لئے یہ ٹیکس لازمی ہیں، اور ان کی حیثیت اس تازہ اور سرخ خون کی ہے، جس سے کہ جسمِ انسانی زندگی حاصل کرتا ہے۔

اشتراکی افکار کی اشاعت اور فلاحی مملکت کے تصوّرات کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے آج ترقی یافتہ ملکوں کی طرح ترقی پذیر ملکوں میں بھی یہ مطالبہ عام طور سے کیا جانے لگا ہے کہ حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ عوام کی جملہ ضرورتوں کی کفالت کریں۔ اب مثال کے طور پر پاکستان کو لیجئے۔ بحیثیت ایک اسلامی مملکت کے، علماء اور غیر علماء سب حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ہر پاکستانی کے لئے نہ صرف تعلیم کا، بلکہ دینی تعلیم کا بھی انتظام کرے نیز سب لوگوں کو طبّی امداد ملے، تمام کے لئے روزگار کا بندوبست ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ ملک کا دفاع بھی ہو اور اسے فوجی اعتبار سے مضبوط سے مضبوط تر بنایا جائے، بلکہ بعض حلقے تو اس پر مُصر ہیں کہ حکومت عوام کے اخلاق کی بھی نگران ہو، اور ان کی مذہبی زندگی کو بہتر بنانے کا فریضہ ادا کرے۔ غرض آج حکومت سے وہ سب کچھ کرنے کے لئے کہا جانے لگا ہے جو پہلے علماء مساجد و دینی مدارس میں، واعظ عام اجتماعات میں، مرشد و صوفی خانقاہوں اور تکیوں میں اور اطباء ذاتی مطبوں میں اپنے اپنے طور پر کرتے تھے اور حکومتوں پر ان کا کسی قسم کا

مالی بار نہ تھا۔ اُس زمانے میں حکومتوں کا صرف یہ فرض سمجھا جاتا تھا کہ وہ داخلی امن قائم رکھیں اور بیرونی حملوں سے ملک کو بچائیں۔ معاشرے کی یہ سب انفرادی و اجتماعی خدمات مختلف طبقے ازخود انجام دیا کرتے تھے، اور ان کے لئے آج کی طرح کوئی حکومت کا گریبان نہیں پکڑتا تھا۔

گزشتہ سال جب پاکستان ہندوستان کی جارحیت کا نشانہ بنا، تو ملک کے دفاع کے لئے پاکستان کا ہر فرد جس پُرخلوص و پُرجوش مذہبی جذبے کے ساتھ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا تھا، اور دشمن کے خلاف صفِ اوّل میں لڑنے والے سپاہی کی طرح ایک معمولی دکاندار بھی، جس نے ہنگامی حالات کے باوجود اشیائے صرف کی قیمتیں بڑھانے سے انکار کر دیا تھا، اسی جذبے سے سرشار ہو کر وُہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہو گیا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم میں تمام طبعی کمزوریوں اور اخلاقی کوتاہیوں کے باوجود دین اسلام سے پُرخلوص شیفتگی کا جذبہ موجود ہے، اور یہ شیفتگی کا جذبہ ایک مؤثر، مثبت اور فعال قوت ہے۔ اس قوت کا عملی اظہار گزشتہ ستمبر میں ملک کے دفاع کے سلسلے میں جس بے مثال شاندار طریقے سے ہوا، وہ ساری دنیا نے دیکھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس قوت سے دفاعِ پاکستان کی طرح پاکستان کی تعمیر و ترقی کا کام نہیں لیا جا سکتا، اور کیا پاکستان کی تعمیر و ترقی کے حقیقی معنی یہ نہیں کہ پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر ہو، انہیں اچھی تعلیم ملے، وہ اخلاقی لحاظ سے بہتر انسان بنیں۔ وہ داخلی اور خارجی امن سے متمتع ہوں۔ اور اس طرح وہ خوش حال و فارغ البال بھی ہوں اور با اقبال بھی۔

اب اگر پاکستان کو اشتراکی نہیں بلکہ فلاحی مملکت بننا ہے، تو مسلمانانِ پاکستان کی جملہ ضرورتوں کو پورا کرنے اور اس مملکت کو اس اعلیٰ مقام تک لے جانے کے لئے لامحالہ خود اہلِ ملک کو اپنی آمدنیوں کا ایک حصّہ دینا ہوگا۔ حال ہی میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے یہ جو بحث اٹھائی ہے کہ ایک اسلامی حکومت کے اپنے عوام سے جو بھی مالی مطالبات ہوتے ہیں، وہ سب زکوٰۃ کے تحت آتے ہیں، جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں پر فرض ہے، اسے اس پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس رائے کی تائید میں آیاتِ قرآنی اور سنت نبوی سے استشہاد کیا ہے، اور یہ

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں مسلمانوں سے قانوناً صرف ایک ہی مالی مطالبہ کیا جاتا تھا، اور وہ زکوٰۃ تھا۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا کہنا یہ ہے کہ اگر مسلمان ایک اسلامی حکومت کے جملہ مالی مطالبات کو زکوٰۃ کے ذیل میں لے آئیں گے، تو ان کو ادا کرنے کے متعلق ان کا نقطۂ نظر وہ نہیں رہے گا، جو بالعموم آج کل ہے۔ وہ اُن کی ادائیگی کو ضمیر کا معاملہ سمجھیں گے، جیسا کہ بعض دوسری قومیں سمجھتی ہیں۔ اس طرح حکومت کے بارے میں ان کا سارا تصوّر بدل جائے گا۔ وہ اس کے مالی مطالبات کو ایک زائد چیز یا بیگار اور تاوان نہیں سمجھیں گے۔ چنانچہ جس طرح وہ ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر اس کے مالی مطالبات ادا کریں گے، اسی طرح اُن کا یہ مذہبی فریضہ ہوگا کہ وہ اس سے ایک فلاحی مملکت یا دوسرے لفظوں میں ایک حقیقی اسلامی حکومت کے تقاضے پورے کرائیں۔ اس ضمن میں حضرت عمر فاروقؓ کا یہ قول یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر دریائے فرات سے لے کر دریائے نیل تک کے علاقے میں کہیں کوئی بھوکا رہتا ہے، تو اس کی ذمّہ داری مجھ پر ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس رائے پر بحث ہو سکتی ہے، اور وہ ضرور ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ بحث محض الفاظ تک محدود ہو کر نہیں رہ جانی چاہیئے۔ موصوف کی اس سے جو اصل غرض ہے، اس پر سوچ بچار کرنے کی ضرورت ہے، سوال یہ ہے کہ اگر ایک اسلامی حکومت کے عائد کردہ مالی مطالبات زائد از واجبات اسلامی رہتے ہیں اور ان کی ادائیگی کے بارے میں ہمارا وہی رویّہ رہتا ہے، جو عام طور سے اس وقت ہے تو یہ مملکت کس طرح ایک فلاحی مملکت بن سکتی ہے؟ اور اگر آپ اسے فلاحی مملکت نہیں بناتے، تو پھر آپ اسے کبھی اشتراکیت کے سیلاب سے محفوظ نہیں رکھ سکیں گے۔